ڈاکٹر ارشاد بیگم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

نذیر احمد کے ناولوں کے منحرف کردار: ایک جائزہ

This article is an analysis of rebel characters in Nazeer Ahmad's fiction. Nazeer Ahmad is among the brightest stars of Ali Garh movement and is credited as the first novelist of Urdu. War for freedom in 1857 is not only a war against colonisers but also a war against decayed society. Nazeer Ahmad wrote many novels to educate women. His novel "Miratul Aroos" is worth mentioning in this regard. Kaleem in Taubatun Nasooh is basically a rebel character. He is aware of the decay of social values but he is not ready to sacrifice his freedom for them.. Ibn ul Waqt is another rebel character who stands against a whole civilization. Azadi Begum in AYAMMA is also a limited but strong voicw against social restraints. Akbari in Miratul Aroos is also a rebel surrenders at the end although, but she seems first rebel of Urdu novel. Nazeer Ahmad doesnot like all these characters but it wont be inappropriate to say that they are the only lifelike characters of his novels. They are prototypes which have paved way for the upcoming rebellious characters.

ناول زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور ایک ناول نگار کے پیش نظر زندگی کے تجربات، گردونواح کے حالات و واقعات اور سیاسی و سماجی منظر نامہ ہوتا ہے۔ زندگی کا انداز کسی ادیب کے لیے ادب تخلیق کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد ادب میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب اردو ادیب نئے نئے رجحانات اور تحریکوں سے متعارف ہوا۔ ادب کی اس تبدیلی کے بارے میں سید احتشام حسین رقمطراز ہیں:

> غدر کے قریب جس ادبی تحریک کی نشوونما ہوئی اور جس میں سرسید، حالی، نذیر احمد کی شخصیتیں بہت نمایاں ہیں اس نے نئی ادبی تحریک کی صرف ابتدا ہی نہیں کی بلکہ ہندوستانی ساکت و جامد سمندر میں طوفان اٹھا دیا۔ اسی وقت سے ہم جدید ترقی پسندی کی روایتیں تلاش کر سکتے ہیں۔[۱]

۱۸۵۷ء کے انقلاب کو کارل مارکس نے ایشیا کا پہلا انقلاب کہا ہے۔ حالات کی تبدیلی نے نظامِ زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ لوگوں کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مسائل سے نمٹنے کے لیے مختلف تحریکیں اپنے نظریات اور تصورات کے ساتھ منظر عام پر آئیں۔ ان میں مزدور تحریک، شاہ ولی اللہ تحریک، وہابی تحریک، راجہ رام موہن رائے کی تحریک

اور علی گڑھ تحریک پیش پیش تھیں۔ ان تمام تحریکوں نے اردو ادب کو متاثر کیا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے فوری اثرات دو صورتوں میں سامنے آئے۔ اس کے مثبت اثرات یہ ہوئے کہ نئی انگریزی تعلیم نے لوگوں کے خیالات کو بدل دیا۔ اس طرح کئی فرسودہ روایات مثلاً ستی اور دخترکشی وغیرہ کی لعنت سے چھٹکارا ہوا جبکہ منفی اثر یہ ہوا کہ بیرونی اقتدار نے برصغیر پاک و ہند کو اپنے آہنی شکنجے میں گھیر لیا۔ اس صورتحال کے بارے میں عتیق احمد لکھتے ہیں:

> جنگ آزادی میں ناکامی بلاشبہ خودمختار اور آزاد ہندوستان کے لیے مزید سو برسوں کی منظّم اور باقاعدہ غلامی کی زنجیریں لے کر آئی۔ جنگ آزادی میں ہزاروں جانوں کا تلف ہو جانا، بے گھر اور بے در افراد کے قافلوں کا جانیں بچانے کے لیے جنگلوں میں مارے مارے پھرنا، شہروں اور قصبوں کی تباہی اور بالخصوص پایۂ تخت کا اپنی عمارتوں اور محلوں کی جگہ ریت اور ملبہ کے ڈھیر بن جانا، شہر کی سڑکوں پر جا بہ جا توپوں اور سولیوں کا نصب ہونا اور باغیوں کے نام پر بے گناہ لوگوں کا توپ دم ہونا .....لیکن لاشوں اور ملبہ کے انہی ڈھیروں کے پیچھے سے غیر محسوس طریقہ پر ہندوستان کا ایک نیا نقشہ بھی ابھر رہا تھا۔[۲]

اسی طرح کی بے حسی سے پورے ہندوستان پر سناٹا چھا گیا تھا۔ لوگ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکے تھے۔ شکست خوردہ ذہنوں میں کسی قسم کی جستجو یا آرزو نہ تھی یہی وہ ابتری کا زمانہ تھا جب ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کا آغاز کیا۔ حکومت برطانیہ کو برصغیر پاک و ہند پر برطانوی راج مسلط کرنے کی بڑی وجہ مغلیہ حکومت کی زوال پذیری تھی۔ اس دور میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کو نہ صرف اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا بلکہ دیگر اغراض و مقاصد بھی لے کر آئے یعنی ایک طرف تو وہ برطانوی راج کو مستحکم کرنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئے تو دوسری طرف وہاں کے مقامی لوگوں کی زندگی کو بھی متاثر کیا۔

اس لرزہ خیز دور میں برصغیر پاک و ہند میں دو بڑی اقوام ہندو اور مسلم اکثریت میں تھیں۔ چونکہ ہندو قوم ہمیشہ محکوم رہی اس لیے حاکم کون ہے؟ ان کے لیے کوئی انجانا سوال نہ تھا لیکن دوسری طرف مسلمان جو کبھی محکوم نہ رہے تھے۔ انگریز راج ان کے لیے ایک تلخ تجربہ تھا۔ ایسے حالات میں انگریزوں کے خلاف نفرت و نخوت کا جذبہ پیدا ہونا مسلمانوں کے لیے فطری عمل تھا۔ ہندو مصلحت پسند قوم تھی، اس لیے انھوں نے حکومت میں شامل ہونے کے لیے اپنے آپ کو جدید تعلیم اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کی کثیر تعداد ایسی تھی جو انگریزوں اور ان کی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس لیے برطانوی راج کے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مسلمان اپنے آپ کو نہ بدل سکے۔ مسلمانوں کی اس حالت کو بدلنے اور انھیں تعلیم و تہذیب سے روشناس کرانے کے لیے معاشرتی اور اصلاحی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

جنگ آزادی کے بعد انتشار نے مسلمانوں کے فکر میں تبدیلی پیدا کی یعنی ذی شعور، روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں قوم کی ترقی و خدمت کی امنگ جاگی۔ پست حوصلے کے حامل لوگوں نے تو خاموشی اختیار کی لیکن بلند

ہمت لوگ میدان میں کود پڑے۔ ان باہمت لوگوں کی فہرست میں سرسید میں پیش پیش تھے۔ ان کے اعلیٰ شعور نے وقت کے تغیر و تبدل کو محسوس کر لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ قوم کو تعصب پسندی سے دور کر کے اس کی اصلاح کریں۔ اصلاحِ قوم کی اس تحریک میں سرسید کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی نعمانی اور راشد الخیری وغیرہ شامل تھے۔

مصائب سے بھرپور اس دور میں بااثر مسلمانوں کے تین گروہ بن چکے تھے ایک گروہ ایسا تھا جو مغرب کی ہر بات کو بلا چوں چرا قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ دوسرا گروہ تنگ نظر علماء کا تھا جو زبوں حالی کے باوجود اپنی ہر قدیم چیز کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا عیسائیت کے مترادف تھا۔ تیسرا گروہ ایسا تھا جو انگریزی تعلیم کی ضرورت تو محسوس کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نوجوانوں میں مذہب اور مشرقیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ نذیر احمد کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔ وہ انگریزی تعلیم کے خلاف نہیں تھے، تاہم اپنی تہذیبی قدروں سے دستبرداری انھیں قبول نہ تھی۔ مسز تاج بیگم فرخی رقمطراز ہیں:

> نذیر احمد ..... ان لوگوں کو جنھوں نے مغربی وضع اور معاشرت اختیار کر لی تھی بالکل پسند نہیں کرتے تھے .....[۳]

ڈپٹی نذیر احمد اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ملکی و قومی ترقی کے لیے تعلیم ہی سب سے مفید ذریعہ ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ تعلیم ہی سے انسان مہذب بن سکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں پر بھی زور دیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ بچے کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے تاکہ آئندہ نسل کی راہنمائی میں مدد مل سکے اس طرح ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ڈپٹی نذیر احمد ہماری ادبی اور قومی تاریخ کا وہ روشن ستارہ ہیں جنھیں پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری اگرچہ اردو میں ناول کا نقطۂ آغاز ہے، تاہم انھوں نے حتی المقدور ناول نگاری کے فنی تقاضے بھی پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ وہ اکثر مقامات پر ناول نگار سے زیادہ مصلح دکھائی دیتے ہیں اور مقصدیت ان پر چھائی ہے تاہم انھوں نے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے ناول نگاری کو خوبصورت طریقے سے استعمال کیا۔ اس طرح اردو میں صنف ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ ناول نے آگے چل کر کئی سطحوں پر سماجی بغاوت کی تصویریں پیش کیں اور جبر کے ماحول کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کی ترجمانی کی۔ تاہم اس مقالے کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے ہم اردو ناولوں کے ان کرداروں کا مطالعہ کریں گے جن میں باغیانہ عناصر موجود ہیں۔

ب۔ ناول کے دورِ اوّل میں باغی کرداروں کا خصوصی مطالعہ

اکبری (مرأۃ العروس)، نذیر احمد

''مرأۃ العروس'' ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھنے والی دو بہنوں کی کہانی ہے۔ اکبری دور اندیش کی بڑی بیٹی ہے اور اصغری چھوٹی بیٹی۔ اکبری پہلوٹھ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے زیادہ نازونعم میں پلی اور نانی کے بے جا پیار نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس نے نہ تو کچھ پڑھا اور نہ ہی کوئی ہنر سیکھا جبکہ اصغری تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار تھی اور وہ بیٹی، بہو، بیوی کی تمام اچھی صفات کا مجسمہ تھی۔ اتفاق سے دونوں بہنوں کی شادی دو حقیقی بھائیوں محمد عاقل اور محمد کامل سے ہوتی ہے۔ اکبری نے اپنی

ہٹ دھرمی سے اپنے گھر کا آرام وسکون برباد کر دیا جبکہ اصغری نے اپنی سلیقہ شعاری اور عقلمندی کی بدولت اپنے گھر کو فردوس کی مانند بنا دیا۔

دونوں بہنوں کا تعلق اشرافیہ خاندان سے تھا اور اشرافیہ خاندان کی کچھ اہم روایات تھیں کہ انھیں ترک کرنا مشکل تھا۔ اشراف سے تعلق رکھنے والے لوگ بامہذب تھے اور اپنی خاندانی روایات کا خیال رکھتے تھے۔ خاندانی روایات میں سب سے اہم روایت تھی کہ اشراف سے تعلق رکھنے والی خواتین اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والی خواتین سے ہی میل جول رکھتی تھیں اور نچلی ذات سے بات کرنا منع تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کا انداز اور کھیل کے مشاغل غرض ہر چیز میں تہذیب وتمدن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جاتا۔ اور اہم روایت ساس سسر کی خدمت کرنا اور ان کے ساتھ ہی رہنا تھی۔ لیکن اکبری تو ایسی روایت شکن ثابت ہوئی کہ اس نے نہ صرف اپنے خاندان کی عزت کو داؤ پر لگا دیا بلکہ سسرال کی عزت کو بھی گنوا دیا۔ اکبری کو کسی بات پر مشورہ دینا یا سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا بلکہ آبیل مجھے مار کے مترادف تھا۔

شادی کو کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ ساس نے اکبری کو سمجھایا کہ اپنی خاندانی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے نچلی ذات کی لڑکیوں سے تعلقات استوار نہ رکھو کیونکہ ان کی عادات اچھی نہیں ہوتیں تو اکبری کو بہت برا لگا اور اس نے محمد عاقل سے علی الاعلان کہہ دیا کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ نہیں رہوں گی یا تو میکے رہوں گی یا پھر الگ گھر لو۔ اکبری نے علیحدگی کا تقاضا کچھ یوں کیا۔

> اس نے چوتھے پانچویں ہی مہینے میاں پر تقاضا کرنا شروع کیا کہ ہم سے تمہاری ماں کے ساتھ نہیں رہا جاتا، ہم یا تو رہیں گے اپنے میکے میں یا اگر ایسی زبردستی ہے تو کسی دوسرے محلے چل رہو۔ ہم سے یہ رات دن کی کلکل نہیں سہی جاتی۔ محمد عاقل ہکا بکا سا ہو کر منہ دیکھنے لگا اور بولا، آخر کچھ بات بھی ہے؟ مجھ سے تو آج تک اماں جان نے تمہاری کوئی شکایت نہیں کی۔[۴]

ساس کی اتنی نرم مزاجی کو بھی اکبری غلط رنگ دیتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے کوئی شکایت نہیں کرتی اور سمجھتی ہے کہ شکایت تو ہمیشہ مظلوم ہی کرتا ہے ظالم نہیں۔ بس اکبری کے سر پر ایک ہی بھوت سوار تھا اور وہ تھا علیحدگی کا۔ عاقل نے بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے کانوں پر جوں تک بھی نہ رینگتی تھی۔ جب محمد عاقل نے بھی اسے اشراف کی بہو بیٹیوں سے ملنے کو کہا تو وہ کڑک کر بولی۔

> ان سے ملے میری جوتی۔ ان سے ملے میری بلا۔ تم بھی وہاں ہماری اماں جیسی پائی لائے۔ وہ بھی میرے پیچھے پڑی رہا کرتی تھیں کہ منہیاری کی بیٹی بنو سے نہ مل۔ وہ بنی ہوئی تھی میری سہیلی، بھلا اس سے میں کیسے نہ ملتی۔ اماں کی ضد میں میں نے بنو کے ساتھ ایک چھوڑ دو گڑیوں کے بیاہ کیے اور اماں سے چرا چرا کر اناج اور پیسے اور کپڑے اور کوڑیاں اتنی چیزیں بنو کو دیں کہ اماں بھی زچ ہو گئیں۔ نانی اماں کے ڈر کے مارے مارتیں تو کیا، بہتیرا کوستی تھیں، برا بھلا کہتی تھیں مگر ہم نے بنو سے ملنا نہ چھوڑا۔[۵]

اکبری خاندانی روایات کے مطابق کھانے پینے کے اونچ خیالات بھی نہیں رکھتی تھی بلکہ نچلی ذات کے لوگوں کے

ساتھ میل ملاپ رکھنے کی وجہ سے اس میں کھانے پینے کے پست خیالات موجود تھے۔ جب اس کا شوہر عید گاہ پر جاتے ہوئے اس کی فرمائش پوچھتا تو وہ اپنی فرمائش کچھ اس طرح بیان کرتی ہے۔

> مزاج دار نے کہا۔ بھٹے اور سنگھاڑے اور جھڑ بیری کے بیر اور مٹر کی پھلیاں اور ڈھیر ساری نارنگیاں ایک ڈفلی، ایک خنجری۔ یہ سن کر محمد عاقل ہنسنے لگا اور کہا ڈفلی اور خنجری کا کیا کرو گی؟ مزاج دار احمق نے جواب دیا۔ بجائیں گے اور کیا کریں گے؟[۶]

محمد عاقل دس روپے کا ملازم ہوتا ہے اور اکبری کی ساس کے کہنے کے باوجود بھی کہ ایک ہی گھر میں کھانا پینا الگ کر لیتے ہیں۔ اکبری نہ مانی اور ضد کر کے علیحدہ ہو گئی اور محمد عاقل کے منع کرنے کے باوجود کہ وہ کسی اجنبی سے نہ ملے وہ عادت سے مجبور ہوتی ہے کیونکہ اسے شروع سے ہی نچلی ذات کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند تھا۔ وہ ایک لٹیری جن کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور اپنا سارا زیور گنوا بیٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کا ساز و سامان بھی بیچ بیچ کر کباب، ربڑی اور کئی دوسری اشیا کھاتی پیتی رہی۔

اکبری کا کردار نذیر احمد کے ناولوں میں پہلا باغی کردار ہے۔ اس سے پہلے اردو میں ناول کی روایت موجود نہیں۔ رتن ناتھ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' میں آزاد کا کردار موجود ہے لیکن ''فسانۂ آزاد'' کو ہم مکمل طور پر ناول نہیں کہہ سکتے۔ یوں اکبری کا کردار اردو ناول کا پہلا باغی کردار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کردار میں ہمیں ان سماجی بغاوتوں کے آثار دکھائی دیتے ہیں جو اس زمانے میں طبقہ اشرافیہ کے نزدیک سماج اور خاندان کے اصولوں، رسوم و رواج اور روایات کے خلاف تھیں۔ اگرچہ نذیر احمد نے اس کردار کو منفی کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور بہت سے حوالوں سے یہ کردار منفی ہی قرار پاتا ہے۔ تاہم کھانے پینے کی پسند میں آزادی یا نچلے طبقے کی لڑکیوں سے میل جول کی آزادی کی خواہش کرنا ایسی بات نہیں جس پر اکبری کو اس درجہ مطعون کیا جاتا۔ اس مستقل سرزنش کی وجہ رسوم و رواج اور روایات کے علاوہ کچھ نہیں۔ تاہم اکبری کو پھوہڑ اور کم عقل دکھایا گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مصیبتوں کا شکار بھی ہوتی ہے۔ سعدیہ خلیل اکبری کے کردار کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ۔۔۔ اکبری کا کردار ہے جو گھریلو ذمہ داریوں سے نالاں ہے اور وہ صرف اپنی ذات کے حوالے سے خواہشات کی تکمیل کی خواہش مند ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو اکبری کا کردار اپنی ذات کا ادراک رکھتا ہے۔ اس کی الٹی سیدھی حرکتوں سے قطع نظر اس کی اپنی ذات کا شعور اس کے ہاں گہرا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا جو دل چاہتا ہے وہ وہی کرتی ہے۔[۷]

نذیر احمد کے ناولوں کے کردار ٹائپ کرداروں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ پہلے مثبت اور منفی خصوصیات کی ایک فہرست مرتب کرتے ہیں اور بعد میں مثبت خصوصیات کو ایک کردار میں اور منفی خصوصیات کو دوسرے کردار میں جمع کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کرداروں کے نام رکھنے میں بھی وہ اسی طرح کی منصوبہ بندی سے کام لیتے ہیں۔ کردار نگاری کا یہ اسلوب دراصل داستان سے مستعار ہے اور بہت حد تک تمثیلی زاویہ رکھتا ہے۔ اکبری کے کردار میں بھی نذیر احمد کے بغاوت کے رویے کو ایک منفی رویے کے طور پر پیش کیا ہے۔ مروجہ اخلاقیات اور سماجی روایات کے مطابق

نذیر احمد کا مؤقف بے شک درست ہو لیکن انسانی آزادی کے حوالے سے دیکھا جائے تو اکبری کی کم عقلی اور غیر سلیقہ مندی اپنی جگہ لیکن اس کی خواہشات کوئی ایسی خطرناک بھی نہیں کہ اس کی اس درجہ حوصلہ شکنی کی جاتی۔

نذیر احمد کے کردار مصنف کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ وہ ان سے جو جی چاہے کام لیتے ہیں اور انھیں کامیاب یا رسوا کرنا بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر اکبری کا کردار اصلاح پسندی کے جذبے کے تحت لکھے گئے ناول کا ایک ایسا کردار ہے جس کی تقدیر اس کے انجام سے پہلے لکھی گئی ہے اور اسے غیر سلیقہ مند اور خاندانی روایات اور اخلاقی اقدار کی پاسداری سے انحراف کی سزا نذیر احمد نے پہلے سے تجویز کر رکھی ہے۔ تاہم کردار نگاری کے جدید تقاضوں اور تعبیرات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اصغری کے غیر فطری حد تک سلیقہ شعار اور دُھلے دھلائے کردار کی نسبت اکبری کا کسی حد تک فطری اور متحرک کردار زیادہ جاندار معلوم ہوتا ہے۔

بغاوت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اکبری کی بغاوت کوئی بڑی سطح کی بغاوت نہیں۔ حتیٰ کہ اسے خود بھی اس کا شعور نہیں کہ وہ اپنے ان اعمال کے ذریعے سماجی سطح پر کسی بغاوت کی مرتکب ہو رہی ہے۔ وہ اسے والدین اور سسرال والوں کی نافرمانی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی اور جتنی عقل اس میں دکھائی گئی ہے اس کے مطابق سمجھ بھی نہیں سکتی۔ اسے صرف روک ٹوک کا رنج ہے اور وہ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معمولات میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہاں ہے۔ یوں کردار نگاری کے اس پہلے مرحلے پر ہمیں اکبری کے کردار کی شکل میں باغی کردار کے ایسے نقوش دستیاب ہوتے ہیں جو بالکل ذاتی سطح پر انحراف سے زیادہ کچھ کرنے کے اہل نہیں اور اردو ناول کے باغی کرداروں کا نقشِ اوّل ہی کہے جا سکتے ہیں۔

کلیم (توبۃ النصوح)، ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' میں کلیم کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے ہے جہاں زندگی مخصوص قواعد و قوانین کے تحت ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ کلیم کا باپ نصوح پہلے تو آزاد خیال تھا اور بیگانہ وار زندگی گزار رہا تھا وہ ہر وقت گھر میں موجودگی کو ناپسند کرتا تھا اور اسے گھر والیوں سے کسی بھی قسم کا اختلاف نہ تھا اور گھر میں کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ لیکن نصوح کے خیالات اس وقت نیا موڑ لیتے ہیں جب اس علاقے میں ہیضے کی وبا پھیل جاتی ہے اور اس کے خاندان کے تین چار افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور وہ خود بھی بیماری کا شکار ہوتا ہے۔ دورانِ بیماری خواب اسے چونکا دیتا ہے اور اس کی سوچ یکسر بدل جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اچانک ہی اپنے خاندان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھا لیتا ہے کیونکہ اسے اپنے گھر والے بہت سی اخلاقی اقدار سے مبرا دکھائی دیتے ہیں۔

> اپنے نفس کے احتساب سے فارغ ہوا تو نصوح کو خاندان کا خیال آیا۔ دیکھا تو بی بی بچے سب ایک رنگ میں رنگے ہیں۔ دنیا میں منہمک، دین سے بے خبر، تب یہ دوسرا صدمہ نصوح کے دل پر ہوا کہ وا حسرتا! میں تو تباہ ہوا ہی تھا، جس نے ان تمام بندگانِ خدا کی بھی باٹ ماری۔ اپنی شامتِ اعمال کیا کم تھی، میں نے اس سب کا وبال سمیٹا۔ مجھ کو خدا نے اس گھر کا مالک اور سردار بنایا تھا اور اتنی روحیں مجھ کو سپرد کی تھیں۔ افسوس

میں نے ودیعت ایزدی کو تلف کیا اور امانت الٰہی کی نگہداشت میں مجھ سے اس قدر سخت غفلت ہوئی۔[۸]

نصوح کو احساسِ ذمہ داری اور احساسِ جرم نے فرائض منصبی کی درست انجام دہی کا حکم دیا۔ چونکہ وہ نفسیات سے لاعلم تھا اس لیے اس نے اصلاحِ اولاد میں تشدد کے رویے کو اپنایا اور عجلت سے کام لیا۔ اسی رویے اور عجلت کی وجہ سے کلیم نے باپ کی اس حالت کو ''جنون'' کہا ہے۔ اور وہ اپنے باپ کی اصلاح کا حصہ نہیں بنتا بلکہ شدید ردعمل کا اظہار کرتا ہے:

میں فرزند کبھی تھا۔ اب سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنا میرے لیے عار اور میں اپنے تئیں ان کی حکومت سے مستثنیٰ اور ان کے اختیارات سے آزاد سمجھتا ہوں۔[۹]

کلیم ہر وقت اپنے باپ کے سامنے سراپا احتجاج رہتا اور اسے کبھی بھی اپنے باپ کی اسلامی باتیں متاثر نہ کر پاتیں۔ کلیم یہی چاہتا تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے نیک و بد سے کوئی غرض نہ رکھی جائے۔ کلیم کو اپنے باپ سے یہی شکوہ رہتا کہ والد صاحب دین داری اور خدا پرستی کے نام سے نئے دستور، نئے طریقے اور نئے نئے قاعدے گھر میں جاری کرنے کے متقاضی ہیں جبکہ وہ اس جدید انتظام حکومت کی مخالفت کے ساتھ گھر میں نہیں رہ سکتا اور وہ کھلے عام یہ بیان دیتا ہے کہ میں بال برابر بھی اپنی زندگی کو بدل نہیں سکتا:

مجھ کو حیرت ہے کہ گھر میں کیوں یہ نئے نئے دستور اور قاعدے جاری کیے جاتے ہیں۔ وہی خدا ہے اور وہی ہم سب ہیں تو جس طرح سے پہلے سے رہتے چلے آئے ہیں، اب بھی رہنے دیں۔ دوسرے کے افعال سے کیا بحث اور کسی کے اعمال سے کیا سروکار۔ اگر کوئی بے دین ہے تو اپنے لیے وہ کوئی زائد اور پرہیز گار ہے تو اپنے واسطے۔[۱۰]

کلیم کی زندگی بھی عجیب کشمکش کا شکار نظر آتی ہے۔ دو مخالف طاقتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً باپ اسے صراطِ مستقیم پر لانا چاہتا ہے جبکہ فطرت گمراہی اور ضلالت کی طرف مائل کرتی ہے۔ کلیم کے لیے فطرت کی طاقت غالب رہی کیونکہ طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ تھا۔ گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے نعیمہ اپنی خالہ زاد صالحہ سے کہتی ہے:

جب سے اس نماز روزے کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ہے، بھلمنساہٹ اور شرافت سب گئی گزری ہوئی۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا۔ نہ وہ زمین رہی نہ آسمان۔ گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل سا گیا ہے۔ نہ وہ ہنسی ہے، نہ وہ دل لگی ہے، نہ وہ چرچے ہیں، نہ وہ مذاق ہے، نہ وہ چہچہے ہیں۔ گھر میں ایک اداسی چھائی رہتی ہے۔ ورنہ ابھی ایک مہینے کا مذکور ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہا کرتی تھیں۔ کوئی گیت گا رہی ہے، کوئی کہانی کہہ رہی ہے ..... اب کوئی گھر میں آ کر تھوکتا بھی نہیں۔ گھر ہے کہ کم بخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے۔[۱۱]

کلیم جب تک کسی مسئلے سے دو چار نہ ہوا۔ باپ سے اختلاف رائے پر ڈٹا رہا لیکن جب اس کی غلطیوں کے صلے میں چند کارندے اور کاشتکار غنڈے گاؤں میں زبردستی داخل ہو گئے اور اس کے باپ کو پانچ چھ ہزار کا گاؤں ہارنا پڑا تو اس وقت اسے اپنی نافرمانی اور گستاخی کا خیال آتا ہے اور وہ اپنے باپ کو معذرت کا خط لکھتا ہے جس میں اپنی غلطی کا اعتراف

کرتا ہے۔

کلیم کے کردار کا انجام دکھا کر دراصل مولوی نذیر احمد نے اپنے جذبۂ اصلاح کی تسکین کی ہے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ نصوح کے حد سے بڑھے ہوئے مذہبی رجحان اور پابندیوں سے کلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے گھر والے بھی تنگ ہیں لیکن کلیم کا رویہ چونکہ زیادہ نمایاں تھا اسی لیے اس میں بغاوت کے عناصر بھی زیادہ نظر آتے ہیں۔

کلیم کا کردار نذیر احمد کی کردار نگاری میں اگلا قدم ہے۔ انھوں نے اس کردار کو اگرچہ معتوب دکھایا ہے اور آخر میں اسے تائب اور شرمسار ہونے پر بھی مجبور کیا ہے تاہم نہ چاہتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے کردار نگاری کے ہنر کو اس ناول میں سب سے زیادہ اسی پر صرف کیا ہے۔ نصوح اور کلیم کے باقی گھر والوں کے کردار بنے بنائے کردار ہیں جو معاشرے کے عام افراد ہیں۔ کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار تخلیق کرنے میں نذیر احمد نے اپنی اختراعی صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔

کلیم شاعر ہے اور ایک ذہین نوجوان بھی۔ وہ اپنے معاشرے کی اقدار اور روایات سے آگاہ ہے لیکن اپنی آزادی کو قربان کرنے پر تیار نہیں۔ جب اسے کوتوال کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو کوتوال اسے کہتا ہے کہ تم کلیم نہیں ہو سکتے، شہر میں اس کی شاعری کا چرچا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کلیم کو شہر میں شہرت اور پذیرائی بھی حاصل ہے۔ اس لیے اس کے لیے اپنی زندگی کی ڈگر کو یکسر بدل لینا بہت مشکل ہے۔ وہ اپنی بغاوت کا شعوری ادراک بھی رکھتا ہے اور اس کے نتائج و عواقب سے بھی آگاہ ہے۔ اس کے باوجود باغیانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ اکبری کا کردار نسبتاً مجہول کردار تھا اس لیے اس کی باگیں نذیر احمد کو اپنے ہاتھوں میں رکھنے میں کوئی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن کلیم کا کردار متحرک کردار ہے۔ نذیر احمد کو اس کردار کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ایسے جملے اور ایسے دلائل بھی اختراع کرنا پڑے ہیں جو خود نذیر احمد کے اپنے مؤقف کے خلاف ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے دیگر دلائل کی بنا پر ناول میں انھیں رد بھی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن آج جب ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں تو جو دلائل انھوں نے کلیم کے حق میں تراشے تھے وہ زیادہ مضبوط اور قابل قبول نظر آتے ہیں۔ یوں کلیم کا کردار نذیر احمد کی منشا سے انحراف کرتا اور ان کے ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

نذیر احمد اگرچہ اس ناول کے ذریعے نصوح کو اصلاح پسندی کی علامت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں اور ایک ایسے کردار کی شکل میں سامنے لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف اپنی اصلاح کرنے پر کمربستہ ہوتا ہے بلکہ اپنے آپ کو اپنے خاندان کا ذمہ دار گردانتے ہوئے سارے خاندان کو راہِ راست پر لانے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی نذیر احمد نے جو مکالمے دیگر کرداروں سے کہلوائے ہیں اور جو منظر نگاری اس ماحول کی کی ہے، اس سے صاف طور پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اصلاحی اعمال کے نتیجے میں اس کنبے کی زندگی بے رونق اور بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ روزمرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفریحات سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور یوں ایک پژمردگی اور ویرانی اس گھر اور اس گھر کے افراد پر چھائی نظر آتی ہے۔

کلیم اپنی فطری طاقت کی بنا پر اس پژمردگی سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے اور اس ویرانی کو قبول نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک دن میں یہ سب کچھ کیسے بدل گیا ہے۔ اور نعیمہ تو یہاں تک کہہ دیتی ہے کہ اس نماز روزے کے چکر میں گھر سے بھلمنساہٹ اور شرافت تک رخصت ہو گئی ہیں۔ نذیر احمد نصوح کے ذریعے دراصل غیر فطری اور میکانکی

طور پر مذہب کا نفاذ چاہتے ہیں۔ عادات و اطوار اور معمولاتِ زندگی ایک عرصے میں تشکیل پاتے ہیں اور ان کا ایک خاص ماحول بن جاتا ہے۔ اس لیے ان کو بدلنا ایک دن کی بات نہیں ہوتی۔ رہن سہن اور اس سے متعلق طور اطوار کسی گھر کے مجموعی ماحول کی مدد سے پروان چڑھتے ہیں۔ ایک خواب کے نتیجے میں نصوح ان سب کو بدلنے کے درپے ہو جاتا ہے تو خواہ اس کا مؤقف اور نیت صحیح بھی ہو، لیکن یہ بہت مشکل امر ہے اور اسی مشکل کا شکار نصوح اور اس کے کنبے کے افراد ہوتے ہیں۔

کلیم ہر معاملے میں اپنے باپ کے مؤقف کی مخالفت کرتا ہے اور اس سے انحراف کے رویے پر گامزن ہے۔ نصوح اسے سمجھاتا ہے لیکن وہ نہیں مانتا اور اس وقت تک اپنی ضد پر قائم رہتا ہے جب تک معاملہ پولیس تک اور غنڈوں تک نہیں پہنچ جاتا۔ ظاہر ہے کہ کلیم کا یہ انجام نذیر احمد کی مداخلت کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ اسے باغی اور سرکش دکھانے کے بعد اس کا انجام بخیر نہیں دکھانا چاہتے اس لیے اسے پھنساتے اور مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی بغاوت سے توبہ کرے اور وہ شرمندگی کا خط اپنے والد کو لکھتا ہے۔

کلیم کئی حوالوں سے اس وقت کے نوجوانوں کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کردار ہے۔ اس کی شاعری اور شہرت، اس کے متشکک تصورات اور باغیانہ اعمال، اس کی زندگی کا تحرک اس وقت کے نوجوانوں کی بہت سی مشترک خصوصیات کو اجاگر کرتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کا دور ہندوستانی نوجوانوں کے لیے ایک انقلاب کی طرف قدم بڑھانے کی سعی سے عبارت ہے۔ لہٰذا کلیم میں بھی نذیر احمد نے تحرک اور اضطراب کا پہلو نمایاں دکھایا ہے۔ اگرچہ وہ اسے منفی سمجھتے ہیں لیکن اپنے دور کی نمائندگی کرنے والا کردار وہ اپنی انھی خصوصیات کی بنا پر بنتا ہے۔ یوں کلیم اپنے بہت سے حوالوں سے اردو ناول کے باغی کرداروں میں اہمیت کا حامل ہے۔

ابن الوقت (ابن الوقت)، ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد ہماری ادبی اور قومی تاریخ کا وہ روشن ستارہ ہے جنھوں نے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل کیا۔ قدرت نے انھیں بہت سی غیر معمولی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا یعنی کہ وہ بیک وقت ادیب، شاعر، مقرر اور اچھے مترجم جیسی خوبیوں سے متصف تھے۔ ان تمام صفات کے پیشِ نظر قوم کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں نے انھیں مصلح بھی بنا دیا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے جب ناول نگاری کا آغاز کیا تو مسلمان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہو چکے تھے۔ مغلوں کی حکومت کی زوال پذیری نے حکومت برطانیہ کو برصغیر پاک و ہند پر برطانوی راج مسلط کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اسی لیے اس دور میں مختلف مملک سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی سرزمین کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا بلکہ اپنے سوچ و فکر میں کئی اغراض و مقاصد بھی لے کر آئے۔ انھوں نے وہاں برطانوی راج کو مستحکم کرنے کے لیے کام کیے اور وہاں کے مقامی لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

اس لرزہ خیز دور میں برصغیر پاک و ہند میں دو بڑی اقوام اکثریت میں تھیں یعنی کہ ایک ہندو قوم اور دوسری مسلمان۔ چونکہ ہندو قوم ہمیشہ ہی محکوم رہی اس حاکم کون ہے؟ ان پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا لیکن دوسری طرف مسلمان جو کبھی محکوم نہ رہے تھے انگریزی راج ان کے لیے ایک تلخ تجربہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ہی زیرِ نگرانی رہے۔ اس لیے انگریزوں

کے خلاف نفرت ونحوت کا جذبہ پیدا ہونا مسلمانوں کے لیے فطری عمل تھا۔ چونکہ ہندو بہت شاطر قوم تھی اس لیے انھوں نے حکومت میں شامل ہونے کے لیے اپنے آپ کو جدید تعلیم اور تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کی کثیر تعداد ایسی تھی جو انگریزوں اور ان کی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اس لیے برطانوی راج کے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی مسلمان اپنے آپ کو نہ بدل سکے اس عرصہ میں معاشرتی اور اصلاحی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو بدلا جا سکے اور انھیں نئی تعلیم وتہذیب سے روشناس کرا کے قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔

غدر کے بعد انتشار نے مسلمانوں کے سوچ وفکر میں تبدیلی پیدا کی یعنی ذی شعور، روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے دلوں میں قوم کی ترقی و خدمت کی امنگ جاگی۔ پست حوصلہ کے حامل لوگوں نے تو خاموشی اختیار کی لیکن بلند ہمت مسلم میدان میں کود پڑے۔ ان باہمت لوگوں کی فہرست میں سرسید پیش پیش تھے۔ ان کے اعلیٰ شعور نے وقت کے تغیر وتبدل کو محسوس کر لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ قوم کی توہم پرستی سے دور کر کے اصلاح کریں گے۔ اصلاحِ قوم کی اس تحریک میں سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی نعمانی اور راشد الخیری شامل تھے۔

اس مصائب سے بھرپور دور میں با اثر مسلمانوں کے تین گروہ بن چکے تھے۔ ایک گروہ ایسا تھا جو مغرب کی ہر بات کو بلا چوں چرا قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ دوسرا گروہ تنگ نظر علماء کا تھا جو زبوں حالی کے باوجود اپنی ہر قدیم چیز کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک انگریزی پڑھنا عیسائیت کے مترادف تھا۔ تیسرا گروہ ایسا تھا جو انگریزی تعلیم کی ضرورت تو محسوس کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ نوجوانوں میں مذہب اور مشرقیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ نذیر احمد کا تعلق بھی اسی گروپ سے تھا۔ مسز تاج بیگم فرخی رقمطراز ہیں:

> نذیر احمد ..... ان لوگوں کو جنھوں نے مغربی وضع اور معاشرت اختیار کر لی تھی بالکل پسند نہیں کرتے تھے .....[۱۲]

ڈپٹی نذیر احمد اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ملکی وقومی ترقی کے لیے تعلیم ہی سب سے مفید ذریعہ ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ تعلیم سے ہی انسان مہذب بن سکتا ہے اسی لیے انھوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں پر بھی زور دیا۔ کیونکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بچے کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے تاکہ وہ بھی آئندہ نسل کی راہنمائی میں مدد کرے تاکہ ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ ان کے خیال میں تعلیم ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے اور اسے تنگ نظری اور تعصب پسندی سے بچاتی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ایک لیکچر میں کالج کی تعلیم کی افادیت کو اہمیت کو بیان کیا ہے جسے تاج بیگم فرخی نے اپنی کتاب میں قلم بند کیا ہے۔

> معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن، گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی و اجتہاد اور بصیرت یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرطِ زندگی ہیں ان کو میں نے کالج میں سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط، مسلمانوں کا ناداں دوست، تقاضائے وقت کی

طرف سے اندھا بہرا۔[۱۳]

غرض نذیر احمد کی ناول نگاری اگرچہ اردو میں ناول کا نقطۂ آغاز ہے تاہم انھوں نے حتی المقدور ناول نگاری کے فنی تقاضے بھی پورے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ وہ اکثر مقامات پر ناول نگار سے زیادہ مصلح دکھائی دیتے ہیں اور مقصدیت ان پر چھائی ہے تاہم انھوں نے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے ناول نگاری کو خوبصورت طریقے سے استعمال کیا۔ اس طرح اردو میں صنفِ ناول نگاری کا آغاز ہوا۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول ''ابن الوقت'' میں دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی تصویر کشی کی ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ کی رائے ہے:

> نذیر احمد شعوری طور پر ایک ایسا ناول تحریر کرنا چاہتے تھے جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی، مذہبی کی عمومی تصویر کشی ہو۔ مسلمانانِ ہند کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں جن مصائب سے گزرنا پڑا اسے سننے کے لیے چیتے کا جگر چاہیے۔ نذیر احمد نے اس سیاسی انقلاب کو ''ابن الوقت'' کے پلاٹ کے لیے منتخب کیا تو ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت موجود تھی کہ آج کے سیاسی واقعات ہی مستقبل میں تاریخ قرار پاتے ہیں۔ بلکہ سیاسی واقعات کی کروٹیں ہی تاریخ کو جنم دیتی ہیں۔[۱۴]

اس ناول میں ''ابن الوقت'' نامی کردار ایسا کردار ہے جو نہ صرف اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور بھی ہے۔ اس ناول میں ابن الوقت کئی مقامات پر روایات سے منحرف ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً انگریزوں سے دلی لگاؤ کی بناء پر غدر کے ایام میں ایک انگریز مجسٹریٹ مسٹر نوبل کی جان، سنگین نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بچانا ایسا ہی مشکل اور ناممکن کام تھا جیسے دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔

اس دور میں فتنہ وفساد اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اگر مسلمانوں کی جان بخشی مشکل تھی تو انگریزوں کے لیے بھی مسلمانوں کے نحوت ونفرت کے جذبات بھی کچھ کم نہ تھے۔ ایسے مشکل حالات میں ابن الوقت نے مسٹر نوبل کو زخمی حالت میں نہ صرف اپنے گھر پناہ دی بلکہ ان کی مرہم پٹی بھی کی اور انگریزی کیمپ میں پہنچانے میں مدد بھی کی۔ ایسا کرنے پر بظاہر تو ابن الوقت پر انگریزوں کی خیر خواہی کی چھاپ لگ گئی اور اس کے صلے میں اس کے مکان پر سرکاری پہرہ بٹھا دیا گیا کہ یہ مکان ''خیر خواہ سرکار'' کا ہے کوئی بھی نظر بھر کر نہ دیکھے۔ اور ابن الوقت کو تحقیقات بغاوت کے محکمے کا کمشنر بنا دیا گیا لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو جب ابن الوقت کی اس حرکت کا پتا چلا تو وہ شدید غصے کا اظہار کرنے لگے مثلاً ایک پادری اور مسلمان کا بحث ومباحثہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مسلمان بھی ابن الوقت کو مسلمان نہیں سمجھتا۔

> مسلمان: اگر آپ ان چیزوں سے جو مذہب اسلام میں بہ تقاضائے مصالح چند در چند حرام کی گئی ہیں، محترز رہیں تو ہم کو آپ کے ساتھ کھانے میں ہرگز انکار نہیں۔ ہاں تو ، اگر ابن الوقت صاحب عیسائی نہیں، اور مسلمان تو یقیناً نہیں، پھر کیا ہیں؟ مسلمان: اگر ابن الوقت صاحب مسلمان ہیں تو پھر دنیا میں کوئی کافر نہیں۔ اس طرح ہمارے ڈپٹی صاحب (کائستھ کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اختیار ہے کہ بت پرستی کرتے جائیں اور عیسائی یا مسلمان ہونے کا دعویٰ کریں۔[۱۵]

ناول میں کئی مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ ابن الوقت مسلمانوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن حجتہ الاسلام تو اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی فکر کے ترجمان اور ان کی کزن کے شوہر ہیں جب ابن الوقت کو اللہ تعالیٰ کے معجزات اور تقدیر کے کھیل کے بارے میں کچھ دلائل دیتے ہیں تو ابن الوقت کے اعتراضات کچھ یہ ہوتے ہیں۔

> خدا کے ہونے پر تو بھلا آپ نے ایک دلیل قائم کی بھی۔ ہر چند میرے دل کو اس سے تسلی نہیں ہوئی اور میں اس وقت یہی سمجھتا ہوں کہ لوگ ہو رہے ہیں اسباب کے خوگر۔ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں سبب ہی سبب نظر آ رہے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے ذہن میں تعیم کر لی ہے۔ اور سبب نہیں پاتے تو جھٹ سے خدا کے قائل ہو جاتے ہیں مگر میں سننا چاہتا ہوں کہ قیامت اور باز خواست قیامت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ [۱۶]

ابن الوقت انگریزی سرکار کے خیرہ خواہ تھے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے اپنے دل کو گورنمنٹ کی نذر کرنے کا دعویٰ بھی بہت دیدہ دلیری سے کیا۔

> پس میں آپ سب صاحبوں کے روبرو اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ میں اپنا دل گورنمنٹ کی نذر کر چکا، خدا نے چاہا تو میری تمام عمر اسی میں بسر ہو گی کہ جہاں مجھ سے ہو سکے گا گورنمنٹ کی فلاح میں، گورنمنٹ کے قیام وثبات میں، گورنمنٹ کے عام پسند ہونے میں کوشش کرتا رہوں گا۔ اے خدا! تو میرا مددگار رہ! [۱۷]

ابن الوقت نے اس دور میں انگریزی وضع اختیار کی جب انگریزی پڑھنا تو درکنار بلکہ انگریزی چیزوں کے استعمال کو بھی کفر سمجھا جاتا تھا۔ اس قدر تعصب تھا کہ انگریزی پڑھنے والے بچوں میں سے اگر کوئی آنکھ بچا کر پانی بھی پی لیتا تو مولوی صاحبان مٹکے تڑوا دیتے۔ جب مسٹر نوبل ابن الوقت کے گھر قیام پذیر ہوئے تو دونوں ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن کو زیر بحث لایا کرتے اور اسی بحث وتکرار نے ابن الوقت کے انگریزی لگاؤ کے جذبات کو مزید بھڑکایا جس کے نتیجے میں ابن الوقت انگریزی وضع کے مرتکب ہوئے۔ اس کے تائید ہمیں کچھ ان الفاظ میں ملتی ہے:

> ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ابن الوقت کو انگریزوں کے ساتھ ایک طرح کی عقیدت تو پہلے سے تھی ہی تین سوا تین مہینے نوبل کے ساتھ رہ کر اس کے خیالات اور راسخ ہو گئے اور عجب نہیں کہ اسی اثناء میں اس نے تبدیل وضع کا ارادہ کیا ہو۔ [۱۸]

ابن الوقت ایسا کردار ہے جس نے صرف ایرانی معاشرت کو چھوڑا اور مغربی وضع اختیار کی بلکہ انگریزوں کی خوشی کے لیے انگریزی طور طریقوں کو بھی اپنایا اس کے عمل سے سوائے مسٹر نوبل کے اور کوئی بھی خوش نظر نہیں آتا بلکہ مسٹر نوبل کے بعد آنے والے انگریز افسر نے اس کے اس طرز عمل کو ناپسند کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

> ابن الوقت ایک ایسے شریف زادے کی خیالی سرگزشت ہے جو پرانی معاشرت چھوڑ چھاڑ کر مغربی وضع اختیار کر لیتا ہے اور انگریزوں کی تقلید میں انگریزی طور طریقوں کو اپنا لیتا ہے مگر اس کے باوجود انگریز حاکم حکمرانی کے غرور میں اس کے طرزِ عمل کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ اس میں برابری کا ادعا پایا جاتا ہے اور یہ وہ جرم ہے

جسے اس وقت کا انگریز کسی طور پر گوارا نہیں کر سکتا۔[۱۹]

''ابن الوقت'' دراصل اپنے عہد کی سیاسی اور مذہبی کشمکش کو بیان کرتا ہے۔ نذیر احمد نے اس کے ذریعے اپنے عہد میں ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کا ناول ایک ایسے کردار کا عکاس ہے جو اس عہد کے مطابق انگریزی معاشرت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کی کوشش کے باوجود میں اسے قبول عام نہیں ملتا۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابن الوقت اپنے عہد کے نوجوانوں کے خیالات کا درست مرقع ہے۔ ابن الوقت کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> دراصل اس (ابن الوقت) کے دل میں چند شکوک ہیں۔ یہ تشکیک ہر اس انسان کے ساتھ لازمی ہوتی ہے جو اپنے دماغ سے کام لینے کا عادی ہو۔ ذہین انسان کسی چیز کو بھی اندھی تقلید اور مذہبی لیبل کی وجہ سے قبول نہیں کر سکتا۔ وہ جب تک ہر نظریہ کو عقلیات کی روشنی میں نہ پرکھ لے وہ اسے قابل قبول نظر نہیں آتا۔ اس لیے ابن الوقت کی بے چین طبیعت بعد میں ہندو جوگیوں، سنیاسیوں، اہل حدیث یعنی وہابی اور پھر بعد میں انگریز پادریوں کی طرف مرجع ہوئی۔ مگر کسی سے بھی اس کی بے چین طبیعت کو سکون نہ ملا۔ یہ سب کچھ، یہ اندرونی کشمکش ناول نویس نے واضح اور کھلے الفاظ میں پیش نہیں کی لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اور اس کی یہ مشکلکانہ طبیعت، تحقیق اور تفتیش کی عادت اور عقل کی رہبری ایک دن اسے مذہب سے کُلّی طور پر باغی بنا دیتی ہے۔[۲۰]

آزادی بیگم (ایامیٰ)، ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ایامیٰ'' کا مرکزی کردار آزادی بیگم ہے۔ آزادی بیگم انقلابی سوچ رکھتی ہے۔ آزادی بیگم کا باپ خواجہ آزاد روشن خیال ہے اور ماں ان پڑھ ہونے کے ساتھ ساتھ قدامت پسند اور مولوی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ دونوں میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ چنانچہ آزادی بیگم کی تربیت دو مختلف نقطہ ہائے فکر رکھنے والوں کی آغوش میں ہوئی۔ باپ تعلیم یافتہ ہونے کہ وجہ سے علم کی وقعت و اہمیت کو سمجھتا تھا لیکن ماں پادریوں کے سکول میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو کفر کے برابر گردانتی تھی۔ یوں اس کشمکش نے آزادی کو فکرِ نو بخشی جس کا اعتراف آزادی بیگم نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

> میرے والدین کے مذہبی خیالات ایک دوسرے سے اس قدر مخالف تھے کہ دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ مجھ کو ایسی چھوٹی سی عمر میں مذہبی باتوں میں غور کرنے کی ضرورت واقع ہوئی کہ میرے ساتھ کی لڑکیوں کو گڑیوں کے سوائے اور کسی چیز کا خیال نہ تھا۔۔۔[۲۱]

والدین کے مذہبی اختلاف رائے نے آزادی بیگم کی غور و فکر کی صلاحیت کو ایسی تقویت بخشی کہ اس کے ذہن میں انقلابی سوچ نے جنم لیا کہ رائج الوقت فرسودہ روایات کو توڑنا کوئی گناہ نہیں۔ آزادی کا یہ رویہ موجود وقت کی سماجی روایات کے منافی اور باغیانہ تھا۔

والدین کے تضادات نے آزادی کی انقلابی سوچ کو جنم تو دیا لیکن حادثاتی طور پر آزادی کا سیڑھیوں سے گرنا اور پادری صاحب کی میم صاحبہ اور بیٹی مس میری کا علاج کے لیے آنا ، اس انقلابی سوچ کا سبب بنا۔ میری اور آزادی کے روابط نے آزادی بیگم کی سوچ وفکر کو نئی جلا بخشی۔ مذہبی اور قومی اجنبیت نے دونوں کے میل جول کو بڑھایا تھا کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ اس طرح آزادی بیگم ایک نئی فکر کے ساتھ زندگی کے مراحل طے کرتی گئی جس کا ذکر ہمیں ناول میں بھی ملتا ہے:

> ۔۔۔ اور میری کی وہ باتیں جن سے آزادی کو دل بگڑا ہادی بیگم کے فرشتوں کو بھی ان کی خبر نہ تھی۔ لڑکیاں لڑکیاں آپس میں سر جوڑے ہوئے صلاحیں کیا کرتیں تھیں۔ ہادی بیگم بوڑھی عورت کو کیا مناسب تھا کہ ان کی مشورتوں میں کھنڈت کرے۔[۲۲]

آزادی چھوٹی عمر سے ہی فہم و ذکاوت کی مالک تھی اور وہ لوگوں کے غیر مناسب رویوں کو بڑی باریک بینی سے دیکھتی تھی مثلاً مولوی ننھیال سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے مذہبی طبقے کی بد حالی پر کڑی ضرب لگائی۔ آزادی بیگم مولویوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کے طرزِ معاشرت میں تبدیلی کی خواہاں ہے۔ ماں جب اس کے لیے ایک مولوی لڑکے کا انتخاب کرتی ہے تو لوگ اسے سمجھاتے بھی ہیں لیکن ماں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی خواجہ آزاد مولویوں کے خلاف ہیں اور ہاں ہادی بیگم ان کی حمایتی آزادی بیگم ذہنی طور پر باپ کی طرف راغب ہے اور اسے طرح طرح کے خیال ستاتے ہیں۔مثلاً

> مولویانہ زندگی کچھ بھی ہو اداس اور بے رونق تو ضرور ہے۔ یہ نہیں کہ ان میں صاحبِ مقدور نہیں۔ ہیں مگر بہت کم ۔ اور ایک مصیبت یہ ہے کہ جن کو مقدور ہے زندگی ان کی بھی غریبوں کی طرح بسر ہوتی ہے بلکہ غریبوں سے بدتر۔ کیونکہ غریبوں کے پلے ٹکا نہیں اور بہ مجبوری نہوت کی وجہ سے شکستہ حال رہتا ہے۔لیکن مولوی خوش حال بھی ہے تاہم اس کی صورت پر نکبتہ اور مفلسی برستی ہے۔معلوم نہیں جیسا ابا جان کہتے ہیں دکھانے کے لیے بتکلف اپنے تیئں زدہ حال بنائے رہتے ہیں کہ لوگ ان پر رحم کریں ۔۔۔ بہر کیف آدمی پہلے پیٹ کو مارے۔تن بدن کو خاک کرے جوانی میں بوڑھا اور تونگری میں مفلس بنے تو مولویوں میں ملنے کا نام لے۔ سو میرے تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ ابا جان کو اتنی بات نہ سوجھ پڑی اور مجھے کہاں جا پھنسایا؟ [۲۳]

آزادی بیگم کی شادی ماں کی منشاء کے مطابق مولوی مستجاب سے ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی بیوگی نے آزادی بیگم کی انقلابی سوچ کو مزید تقویت دی۔ آزادی بیگم جس معاشرے میں سانس لے رہی تھی وہاں بیوہ کے نکاحِ ثانی کو گناہِ عظیم گردانا جاتا تھا۔ آزادی بیگم نے اپنے طرزِ عمل سے عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے ۔ آزادی بیگم نے مردوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بیوہ عورت کے بھی کچھ ارمان ہوتے ہیں۔ نذیر احمد نے آزادی کے کردار کے ذریعے بیوہ کے متعلق تنگ نظری اور توہم پرستی پر انگلی اٹھائی۔ ڈاکٹر انیس ناگی اس ناول کے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں:

> نذیر احمد اس ناول میں بیوہ اور مولوی کی کہانی سے ایک کی آزادی اور دوسرے کی اصلاح چاہتے ہیں۔[۲۴]

آزادی اپنے دور کی بیوہ عورتوں کے متعلق مروجہ تصورات پر بہت تشویش مند تھی۔ وہ معاشرے کی اس سوچ کے منافی تھی کہ شادی شدہ عورت بناؤ سنگھار تو کر سکتی اور جب چاہے، جہاں چاہے اپنی منشاء کے مطابق جا سکتی ہے لیکن بیوہ بے چاری پر ہر طرح کی پابندی ہے ایسا کیوں؟ دراصل آزادی خود جوانی میں بیوہ ہوئی تھی اس لیے وہ بیوہ کے جذبات و احساسات سے اچھی طرح آشنا تھی اور چاہتی تھی کہ بیوہ سے ناروا سلوک نہ برتا جائے اس لیے وہ اکثر سوچتی رہتی:

۔۔۔۔ جو دن آتا ہے بیوگی کی نئی مصیبت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جن کے مرد پاس ہوتے ہیں ان کا بھلا کیا مذکور ہے جن کے مرد پردیس میں ہوتے ہیں کیا سر نہیں دھوتیں۔ کپڑے نہیں بدلتیں۔ پھول چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ مہندی نہیں لگاتیں۔ بناؤ سنگھار نہیں کرتیں۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ میں نے ذرا کی ذرا آئینے میں مونہہ کیا دیکھا کہ لگی چاروں طرف سے بھرمار ہونے۔ ان زبردستی کی بدگمانیوں کی روک تھام مجھ سے کیا ہو سکے گی۔[۲۵]

آزادی کے دل میں معاشرے کی فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور وہ انقلاب چاہتی تھی۔ بیوہ عورتوں کی بے بسی اور لاچاری اس کے لیے کافی تکلیف دہ اور پریشان کن تھی۔ اپنے اردگرد موجود کئی بیواؤں کی کسمپرسی کی حالت سے بیزار ہو چکی تھی اور چاہتی تھی کہ ان میں حقوق سے آگہی کا شعور پیدا کرے اور ان میں بھی اس جیسی انقلابی سوچ جنم لے۔ اسی لیے وہ بیواؤں سے ملتی۔

بیواؤں کی کیا کمی تھی ذرا کی ذرا خیال کیا تو بیسیوں رانڈیں سمجھ میں آئیں۔ اس کے بعد آزادی نے یہ شیوہ اختیار کیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیوہ عورتوں سے ملتی اور ان سے اختلاط پیدا کر کے ان کے بطون دریافت کرتی۔ کئی برس تک اس کو اسی کی دھن رہی۔ آخر مرتے دم اس نے بیان کیا کہ یوں تو سینکڑوں رانڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مگر دو اوپر پچاس عورتوں کی نسبت میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کا کوئی حال مجھ سے مخفی نہیں رہا۔[۲۶]

ناول کے آخری حصے میں آزادی بیگم بیمار ہو جاتی ہے اور بیماری کی وجہ سے کافی ناتواں ہو جاتی ہے اور اپنے آپ کو قریب المرگ سمجھتی ہے لیکن پھر بھی اپنے مقصد کو نہیں بھولتی وہ اسلامی معاشرے میں مروجہ ہندوؤانہ روایات کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتی ہے۔

اے لوگو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہوں بے شک خدا سارے گناہوں کو معاف کرے گا۔۔۔ کیا بھول ہوئی ہے جن دنوں لوگوں کی طرف سے میرے پاس شادی کے پیام پر پیام چلے آتے تھے۔ ایک شخص نے ہم خرما وہم ثواب لکھا تھا کہ اگر تم دوسرا نکاح کر لوگی تو تمہاری دیکھا دیکھی جتنی بیوہ عورتیں نکاح کریں گی۔ روز قیامت تک اس مری ہوئی سنت کے زندہ کرنے کا ثواب تم کو ملے گا۔ اگر ان دنوں نکاح پڑھا لیتی اس نیت سے کہ دوسروں کے لیے سند ہو تو بے شک اس کے یہ معنی تھے کہ اتنی عورتوں کو گویا میں نے عذاب بیوگی سے نجات دی۔[۲۷]

آزادی بیگم ان حوصلہ مند لوگوں میں سے تھی جو اپنی زندگی کسی مقصد کے تحت گزارتے ہیں اور دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں قربان کر دیتے ہیں آزادی نے بھی اپنی جنسی خواہشات کو لوگوں کی خوشی کے لیے قربان کر دیا لیکن یہ

ٹھان لی کہ وہ اوروں کے ساتھ ایسا نہ ہونے دے گی اور اپنی تقریر سے لوگوں کو ایسی ہٹ دھرمی اور سنگدلی سے روکنے کی کوشش کی۔ آزادی بیگم کا یہ احتجاج قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں:

> بسترِ مرگ پر آزادی بیگم کی تقریر کے سہارے نذیر احمد نے غیر اسلامی معاشرتی رسوم کے خلاف احتجاج کیا ہے اور عورتوں کی بے بسی اور جنسی گھٹن کو ان کی شخصیت کے مسخ ہونے کا جواز بتایا۔[۲۸]

آزادی بیگم نے اپنی آخری وصیت میں مردوں سے خطاب کرتے ہوئے ان وجوہات کی نشاندہی بھی کی جن کی وجہ سے اس نے نکاحِ ثانی نہ کیا۔ آزادی بیگم خود تو نکاحِ ثانی نہ کر سکی لیکن اس فرسودہ معاشرتی نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے ایک انقلابی قدم اٹھایا۔ آزادی نے پرسوز الفاظ میں غلط معاشرتی اقدار اور رسم و رواج کی نشاندہی ان الفاظ میں کی۔

> لیکن جب مجھ کو خود رسم و رواج سے مقابلہ کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ خدا کی خدائی میں اس سے زیادہ کوئی زبردست چیز نہیں ۔ جب نکاح کا خیال آیا تب تب ارادہ ہوا اور جب جب ارادہ ہوا رسم و رواج نے سب منصوبے غلط کر دیے۔ میں کہتی تھی ہے ہے لوگ مجھ کو دوخصمی کہیں گے۔ برابر کی بیبیاں مجھ کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گی ۔۔۔ میرے سبب سے میری نسل انگشت نما ہو گی۔ نہیں نہیں میں اس بے عزتی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس سہاگ کو لگے آگ جس کی وجہ سے آبرو پر حرف آئے۔[۲۹]

گو آزادی بیگم نے خود تو نکاحِ ثانی نہ کیا لیکن مروجہ فرسودہ روایات کو تبدیل کرنے میں مدد دی کیونکہ اس کے آخری خطاب نے مردوں کے اذہان کو جھنجھوڑ ڈالا اور ان کی سوچ میں تبدیلی پیدا کی۔ وہاں پر موجود سب مردوں نے ٹھان لی کہ معاشرے میں کوئی بیوہ کو بیوگی کی حالت میں نہیں بٹھائے گا بلکہ اس کا نکاحِ ثانی کرے گا۔ آخرکار آزادی کی انقلابی سوچ نے معاشرے کی فضول روایات کے خلاف نہ صرف خود بغاوت کی بلکہ کئی اور لوگوں کو اس بے حسی کی دلدل سے نکالا اور ان میں تغیر و تبدل کی عظیم سوچ پیدا کی جو کہ بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔ ڈاکٹر افضال بٹ لکھتے ہیں:

> نذیر احمد نے اس ناول کے ذریعے سماج کی ایک بڑی برائی کو اجاگر کیا ہے۔ ہندوستانی سماج میں ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی ممنوع ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں راجہ رام موہن رائے نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی۔ مذہبی اصول اور قوانین کی کھل کر مخالفت کی۔ ہندو سماج میں خاص کر عورتوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کو ختم کرنے کے لیے ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ناول بھی اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا۔[۳۰]

نذیر احمد کا اصل مقصد مسلمانوں کی اصلاح تھا اور خاص طور پر وہ روایات جن کا تعلق خواتین سے تھا مثلاً بیوہ کا نکاحِ ثانی ، شادی و مرگ کی روایات وغیرہ اس ناول میں آزادی کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے وہ اصلاحی مقصد حاصل کیا جس کے وہ خواہاں تھے۔ نذیر احمد کے اسلوب کے مطابق ان کا یہ کردار اسم بامسمیٰ ہے اور نام کی طرح وہ معاشرتی جکڑ بندیوں سے آزادی چاہتی ہے۔ آزادی بیگم تمام بیوہ خواتین کو فرسودہ روایات سے آزادی دلوانا چاہتی ہے مجموعی طور پر یہ ایک کامیاب ناول ہے اور اپنے بعد کے آنے والے دور کے لیے شعور پیدا کرنے کا پیش خیمہ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نذیر احمد کے اصلاحی نقطہ نظر کی روشنی میں ان کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نذیر احمد کا یہی نقطۂ نظر ہے کہ آدمی اپنی تہذیب سے وابستہ رہے ورنہ وہ ابن الوقت بن جائے گا۔ یہی بنیادی خیال توبۃ النصوح، مرأۃ العروس، فسانۂ مبتلا اور ان کے دوسرے ناولوں میں ملتا ہے۔ نذیر احمد کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان معاشرہ میں اصلاح کی جائے اور اصلاح کی نوعیت یہ ہو کہ معاشرہ ظاہردار بیگ، ابن الوقت نہ بنے بلکہ اپنی تہذیب،اپنی اقدار پر فخر کرتے ہوئے جدید علوم کا اکتساب کرے۔ اس اعتبار سے نذیر احمد کا نقطۂ نظر سب سے زیادہ اہم نظر آتا ہے۔[۳۱]

کردار نگاری کے حوالے سے نذیر احمد کے باغی کرداروں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو جو امر سب سے واضح طور پر سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ یہ کردار ابتدائی درجے کے ہیں، کردار نگاری کے حوالے سے بھی اور بغاوت کے حوالے سے بھی۔ کردارنگاری کے لحاظ سے ان میں ان خصوصیات کا فقدان ہے جو فطری طور پر ارتقا پاتے ہوئے کرداروں میں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر کردار ناول کے آغاز سے انجام تک ایک جیسے بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے رویوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

بغاوت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی بغاوتیں زیادہ تر نجی اور شخصی معاملات تک محدو د ہیں۔ اگرچہ ان میں ایک پہلو سماجی بھی ہے اور وہ سماجی سطح پر بھی بعض انحرافات کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن زیادہ تر ان کا زاویہ شخصی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کردار مصنف کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہیں جنھیں وہ اپنی مرضی اور مؤقف کے مطابق پیش کرتا اور ان کی قسمتوں کے فیصلے کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ نذیر احمد کے یہ کردار داستانوں کے مافوق الفطرت اور زندگی کے حقیقی پہلو سے کسی حد تک دور کرداروں کے بعد اردو فکشن میں متعارف ہوئے ہیں اور ان کی پیش کش میں یہ بات بھی اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ ان کا تعلق غیر حقیقی، ماورائی یا تصوراتی وتخیلاتی دنیا کے بجائے جیتی جاگتی زندگی سے ہے۔ ان کے نام، ان کے کام اور ان کے عادات و اطوار حقیقی انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی کردار ان کرداروں کی بنیاد ہیں جو آگے چل کر اردو ناول کے نمائندہ باغی کرداروں کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، ص۲۵

۲۔ عتیق احمد، اردو ادب میں احتجاج ابتدا سے انیسویں صدی تک، مکتبہ عالیہ لاہور، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۷ء، ص۱۵۰

۳۔ تاج بیگم فرخی، ڈپٹی نذیر احمد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۱ء، ص۱۰۶

۴۔ نذیر احمد، ڈپٹی، مرأۃ العروس، علم وعرفان پبلی کیشنز، لاہور، فروری ۲۰۰۴ء، ص۲۷

۵۔ ایضاً، ص۲۸

۶۔ ایضاً، ص۳۳

۷۔ سعدیہ خلیل، عورت مرد ناول نگاری کی نظر میں مشمولہ ادب کی نسائی ردِتشکیل، مرتبہ:فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص۱۵۱،۱۵۲

۸۔ ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء، توبۃ النصوح، مجلس ترقی ادب ،لاہور، طبع دوم ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۸۲، ۲۸۳

۱۲۔ تاج بیگم فرخی، ڈپٹی نذیر احمد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۴۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو ناول میں تاریخی ناول نگاری، گنج شکر پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۲، ۴۳

۱۵۔ نذیر احمد، ڈپٹی، مجموعہ نذیر احمد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۴۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۸۔ ایضاً، ص، ۶۳

۱۹۔ ایضاً، ص، ۱۵۷

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نگاہ اور نقطے، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۲

۲۱۔ نذیر احمد، مولوی، حافظ، ایامیٰ، مطبع فیضی، دہلی، ۱۸۹۱ء، ص ۱۷۷

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۴۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، نذیر احمد کی ناول نگاری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۱۰۰

۲۵۔ نذیر احمد، مولوی، حافظ، ایامیٰ، ص ۱۴۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۲۸۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، بیکن بکس، ملتان، بار اول ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۷

۲۹۔ نذیر احمد، مولوی، حافظ، ایامیٰ، ص ۱۸۳، ۱۸۴

۳۰۔ محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۶

۳۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۶